محمد سہیل اقبال
پی ایچ۔ڈی اسکالر (اُردو)
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
محمد راشد اقبال
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو،
گورنمنٹ اسلامیہ کالج، قصور

شمس الرحمٰن فاروقی کے تنقیدی نظریات پر اعتراضات

(اُردو کا ابتدائی زمانہ کے تناظر میں)

'Literary Cultures in Indian History was a linguistic venture of Chicago University. An article titled: 'Early Urdu' was written by Shams-ur-Rehman Farooqi for that project. Shams-ur-Rehman Farooqi through his article criticized Sir Thomas Roe and Arthur Coke Burnell's work on Urdu, especially their views, on the origin of the names of the language, have been disparaged a lot to prove the eminent scholars erroneous. Shams-ur-Rehman Farooqi has mostly counted on Aab-e-Hayat as the source of his research and commentary, while Aab-e-Hayat itself not reliable for being full of the subjectivity of Moulana Muhammad Hussain Azad. This article aims at pointing out the distortion of historical narrative in Shamas-ur-Rehman Farooqi's commentary on the early development of Urdu Language and Literature.

شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر شیلڈن پالک (Sheldon pollok) نے ایک لسانی منصوبہ کی بنیاد رکھی جس کا نام ''Literary Cultures in Indian History'' تھا۔اس منصوبہ کا مقصد ہندوستان کی قدیم و جدید زبانوں کے آپس میں لسانی روابط کے حوالے سے تحقیق کرنا تھا۔شمس الرحمٰن فاروقی کے حصّے میں جو مقالہ آیا اس کا عنوان''Early Urdu'' تھا۔ یہ انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا لیکن بعد میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اسے اُردو میں ترجمہ کر دیا اور اس کتاب کا نام اُردو کا ابتدائی زمانہ (ادبی،تہذیب و تاریخی پہلو) رکھا۔اس کتاب کو شمس الرحمٰن فاروقی نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کتاب میں اُردو کے ابتدائی زمانے کا ادبی،تہذیبی اور تاریخی پس منظر میں لسانی مباحث کا مطالعہ پیش کیا ہے اور اُردو کے ان ابتدائی ادوار پر بحث کی ہے جو اُردو کی نشونما پر گہرے اثرات مرتب کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں ۔اس کتاب کے باب اول کا عنوان''تاریخ،عقیدہ اور سیاست'' ہے۔

اس باب میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اُردو زبان کے ماضی کو اور خاص طور پر اس کے مختلف ناموں کا تاریخی پس منظر پیش کیا ہے ۔جیسے ہندوی، ہندی، دہلوی، گجری، دکنی اور پھر ریختہ۔ان کے علاوہ اُردو کے لیے ''ہندوستانی'' کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے جس پر شمس الرحمٰن فاروقی نے حوالوں کے ساتھ تفصیل سے بحث کی ہے ۔شمس الرحمٰن فاروقی بیان کرتے ہیں:

> ''انگریزوں نے اس زبان کے لیے اپنی ایجاد یا پسند کے نام استعمال کیے ہیں۔ جہانگیر کے دربار میں جیمز اول کے ایلچی سر ٹامس رو(Sir Thomas Roe) کے ساتھی ایڈورڈ ٹیری نے اپنی کتاب A Voyag To East India (لندن ۱۶۵۵) میں اس زبان کو ہندوستان Indostan کے نام سے یاد کیا ہے۔۔۔انگریزوں نے اور نام جو اس زبان کے لیے استعمال کیے ان میں Hindoostanic, Hindostanee, Indostan, Moor۔۔۔'' [۱]

سر ٹامس رو کے حوالے پر شمس الرحمٰن فاروقی یہ اعتراض کرتے ہیں:

> '' ''ہندوستانی'' کو مستثنیٰ کر دیں تو انگریزوں کے دیئے ہوئے متذکرہ بالا ناموں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے کبھی اُردو بولنے والوں نے استعمال کیا، یا اگر استعمال نہ بھی کیا ہو تو اس سے آشنا رہا ہو۔ یہ سب نام انگریزوں نے اپنی لاعلمی یا سیاسی ضرورتوں کے باعث ایجاد کیے تھے۔'' [۲]

لیکن اُردو ادب کی قدیم و جدید تاریخ میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے کہ سوائے ''Moors'' کے علاوہ باقی تمام نام لفظ ''ہندوستانی'' کی ارتقائی شکلیں ہیں ۔ان کی ترتیب بھی اس طرح ہونی چاہیے تھی Indostan، Hindoostanic، اور پھر Hindoostanee۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے انگریزوں کے بیان کو رد کیا ہے ۔لیکن شمس الرحمٰن فاروقی کے نقطہ نظر پر بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے ۔ اصل میں انگریز اپنے بیان کے حوالے سے بالکل درست ہیں جو اُردو کے لیے ''ہندوستانی'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ وہ نو آباد کار تھے اور اُن کے خیال میں ہندوستان کی مناسبت سے ''ہندوستانی'' نام ہی بہتر تھا لیکن ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ کسی دوسرے ملک کا باشندہ ''ہندوستانی'' لفظ ہندوستان کی ہر زبان کے لیے استعمال کرسکتا ہے اور ہندوستان میں بولی جانے والی ہر زبان ''ہندوستانی'' ہے۔ جن ممالک میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں ان کو اس ملک کے نام کی مناسبت سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے بلوچی، سندھی، پنجابی اور پشتو کو پاکستانی زبانیں کہیں گے۔اس دور میں ہر ملک میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں ۔لیکن باقی اقوام صرف ایک قومی زبان کے علاوہ اس ملک کی دوسری زبانوں سے واقف نہیں ہوتے بلکہ بعض دفعہ تو ناموں سے بھی لاعلم رہتے ہیں اور ایسا بھی ہے کہ قومی زبان کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا صرف اس وجہ سے کہ ان کا نام اس ملک کی مناسبت سے نہیں ہوتا ۔جیسے انگلستان سے انگریزی، چین سے چینی،

جاپان سے جاپانی، جرمنی سے جرمن،فرانس سے فرانسیسی، یہ نام تو سب کو معلوم ہیں لیکن اُنگولا کی قومی زبان پرتگالی، پانامہ کی ہسپانوی اور برازیل کی پرتگیز وغیرہ کا ہر خاص و عام کو معلوم نہیں ہے۔ اس بحث سے بھی چند سوال اٹھتے ہیں:

۱۔ کیا ہندوستان میں بولی جانے والی ہر زبان ہندوستانی نہیں ہوسکتی ؟

۲۔ کیا اُردو کے لیے ہندوستان میں ہندوستانی کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا ؟

اس بحث سے مراد ہرگز یہ نہ لیا جائے کہ اب ہم بھی اُردو کے لیے ''پاکستانی'' کا لفظ استعمال کریں۔ موجودہ نام ''اُردو'' پاکستان اور ہندوستان دونوں ممالک میں استعمال ہوتا ہے اور دونوں ممالک کے مشاہیر اس پر متفق ہیں۔

۳۔ سنسکرت کے بعد اُردو اور ہندی وہ زبانیں ہیں جنھوں نے تیزی سے ترقی کی اور عالمی سطح پر اپنی شناخت اور حیثیت اجاگر کی۔لیکن کیا ان دونوں زبانوں کو بھی ہندوستانی نہیں کہا جا سکتا؟
شمس الرحمٰن فاروقی نے گلکرسٹ کا یہ حوالہ استعمال کیا ہے:

> '' ''ہندوستان'' (Hindoostan) ایک مرکب لفظ ہے، اور اس کے معنی ہیں ''ہندوؤں کا ملک'' یا ''نیگرولوگوں کا ملک'' ۔۔۔۔اس ملک کے خاص باشندے ہندو اور مسلمان ہیں ان کو،اور اُن کی زبان کو بھی ہم بے کھٹکے ایک عمومی، جامع اور مانع اصطلاح ''ہندوستانی'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔۔۔
>
> اس ملک کا نام ،اور اس کی مقامی زبان ،دونوں ہی جدید ہیں لہٰذا جب میں اوّل اوّل اس زبان کے مطالعے اور مشق میں مشغول ہوا تو مجھے اس زبان کے لیے ''ہندوستانی'' سے زیادہ مناسب نام کوئی معلوم ہوا۔۔اس ملک کی عوامی زبان کے لیے ہمیں اور سب نام مستقلاً ترک کر دینے چاہیں اور وہ بے معنی نام Moors بھی ترک کر دینا چاہیے۔ ان سب کی جگہ ہمیں صرف ہندوستانی کہنا چاہیے۔'' ۳

اس حوالے میں گلکرسٹ نے ہندوستان کے معنی جس پس منظر میں لکھے ہیں وہ جغرافیائی نہیں مذہبی ہیں۔ کیونکہ انگریزوں کے لیے نو آبادیاتی دور میں مذہبی اختلافات پیدا کرنا سود مند تھا۔ اس نام کی ارتقائی حقیقت کا پس منظر دریائے سندھ کی مناسبت سے سندھو تھا اور سندھو لفظ ہریانوی زبان میں لفظ ''ہندو'' میں تبدیل ہو گیا اور ہندو سے ہند بنا، ہند سے ہندوستان اور پھر ہندوستان میں رہنے والا ہندوستانی کہلایا۔لفظ ''ہندوستان'' مذہب کی مناسبت سے نہیں(گلکرسٹ نے مذہبی پس منظر میں استعمال کیا ہے)بلکہ ہندوستان کا یہ نام جغرافیائی حوالے سے رکھا گیا۔

آج ہندوستان میں ہندی اور اُردو بڑی زبانیں ہیں ۔سنسکرت کے الفاظ ہندی میں اور ہندی کے الفاظ اُردو

میں ضرور آئے لیکن ان تینوں زبانوں کی شناخت الگ الگ ہے ۔رہی بات سنسکرت کے زوال کی تو یہ زوال آنے والے دور میں ہندی اور اُردو کو بھی آ سکتا ہے ۔کیونکہ انگریزی زبان کے الفاظ ہندی اور اُردو میں کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں تو تعلیمی نظام انگریزی میں ہے اس لیے وہاں صورتِ حال زیادہ تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے ۔اپنے دورِ حکومت میں وزیرِ اعظم واجپائی اس خدشہ کا اظہار کر چکے ہیں کہ'' لوگ انگریزی زبان کی وجہ سے اپنی مادری زبانیں کھو رہے ہیں''۔ واجپائی کو اس کا احساس تھا کیونکہ خود ہندی کے اچھے شاعر ہیں۔

زبانوں کے ناپید ہونے کے بارے میں برنارڈ کو میری Bernard Comrie نے اپنے ایک مضمون ''Languages of The World'' میں لکھا ہے:

"Grimes and Grimes (1996) This work lists over 6,7oo languages spoken in the world today or having recently became extinct." [۴]

ترجمہ: گرائمز اینڈ گرائمز کے 1996ء کے سروے کے مطابق تمام دنیا میں 6,700 زبانیں بولی جاتیں ہیں۔ جن میں چند ایک حالیہ دور میں ناپید ہو چکی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب اُردو کا ابتدائی زمانہ میں ہابسن جابسن کا یہ حوالہ بھی شامل کیا ہے کہ ہندوستان میں لفظ اُردو کا ورود بابر کے ساتھ ہوا اور یہ کہ بابر کی لشکر گاہ کا نام اُردو معلّٰی تھا اور وہ زبان جو اس لشکر گاہ کے نواح میں پیدا ہوئی ،زبان اُردو معلّٰی کہلائی۔[۵] شمس الرحمٰن فاروقی نے اس حوالے پر یہ اعتراض کیا ہے:

''یول اور برنیل صاحبان (مصفنین ہابسن جابسن) کی سند تو یقیناً درست ہے ۔لیکن اس پر جو اظہار خیال کیا گیا ہے وہ صریحاً غلط باتوں پر مبنی ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ پہلے بھی ہندوستان میں ترکوں کی کمی نہ تھی ۔لہٰذا لفظ ''اُردو'' کے ورود کو بابر کی آمد سے منسلک کرنا غیر ضروری ہے ۔دوسری بات یہ کہ بابر نے کبھی بھی دہلی میں طویل عرصے تک قیام نہ کیا۔ تیسری بات یہ کہ ''ہندوی، ہندی، دہلوی'' نام کی زبان دہلی اور اس کے نواح میں بابر سے بہت پہلے موجود تھی۔شمالی ہند میں مغلوں کی آمد کے نتیجے میں وہاں کوئی نئی زبان بالکل نہ پیدا ہوئی۔'' [۶]

یہاں شمس الرحمٰن فاروقی نے جو اعتراضات کیے ہیں وہ سب قیاسی ہیں ۔کیونکہ اگر بابر سے پہلے ہندوستان میں ترک تھے تو شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کا کوئی تاریخی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔اور لفظ اُردو کے ورود کو بابر کی آمد سے منسلک کرنا غیر ضروری ہے تو شمس الرحمٰن فاروقی ہابسن جابسن کی سند کو درست کیوں تسلیم کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ بابر نے کبھی بھی دہلی میں طویل عرصے تک قیام نہ کیا تھا ۔لفظ ''اُردو'' کے وجود میں آنے

سے بابر کے قیام کرنے اور نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس باب کا تیسرا پہلو شمس الرحمٰن فاروقی نے سیاسی حوالے سے پیش کیا ہے اور خاص طور پر اُردو کو انگریزوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے کس طرح استعمال کیا ۔جب برصغیر میں قابض انگریزوں کو حکومت کرنے کے لیے یہاں کی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی۔انگریزوں کے فورٹ ولیم کالج کے قائم کرنے کے مقاصد تعلیمی نہ تھے بلکہ سیاسی تھے ۔اس حوالے سے سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

''۱۰جولائی ۱۸۰۰ء کو مطابق ۱۷صفر ۱۲۱۵ھ کو کالج کا افتتاح کر دیا اور اسی تاریخ کو کالج کا مسودہ آئین وضوابط منظور ہوا،لیکن دستاویز پر جو عبارت درج کی گئی وہ معنی خیز ہے۔'' ۷

محمد عتیق لکھتے ہیں:

''(ویلزلی) کے حکم سے اس دستاویز پر ۴مئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی گئی جو میسور کے دارالسلطنت سرنگا پٹم میں برطانوی افواج کی شان دار فیصلہ کن فتح کی پہلی سالگرہ کی تاریخ تھی۔'' ۸

ٹیپو سلطان کو شکست دینے کا اصل جشن انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھ کر منایا اور ٹیپو سلطان جس نے سامراج کے سامنے جھکنے سے انکار کیااور شہادت کا رتبہ پایا ۔ٹیپو سلطان کی لاش کے پاس کھڑے ہو کر جنزل ہیرسGen. Harris نے کہا تھا کہ آج ہندوستان ہمارا ہے اور انگریزوں نے ٹیپو سلطان کی تذلیل کرنے کے لیے اپنے کتوں کا نام ٹیپو رکھا۔لیکن اُردو کے شاعر اسمٰعیل میرٹھی نے انگریز سامراج کی خوشنودی کے لئے ''ہمارا کتا ٹیپو'' جیسی نظمیں لکھیں۔اسمٰعیل میرٹھی کی نظم ''ہمارا کتا ٹیپو'' کے چند اشعار یہ ہیں:

''ٹیپو ہے اس کا نام یہ کتا عجیب ہے
بڈھا ہے با ادب ہے نہایت غریب ہے
ہم دونوں بھائی بہنوں سے الفت ہے اس قدر
جب دیکھتا ہے دور سے آتا دوڑ کر
افسوس میرے ٹیپو! حیراں ہوں کیا کروں
کس ڈھب سے تیرے ساتھ محبت کیا کروں
آتا ہے کم جہان میں تجھ سا رفیق ہاتھ
جاتا ہوں جب میں سیر کو رہتا ہے میرے ساتھ'' ۹

فورٹ ولیم کالج کی باگ ڈور گلکرسٹ کے ہاتھ میں تھی جو شعبہ اُردو کا سربراہ بھی تھا۔فورٹ ولیم کالج میں

ان کا اثر و رسوخ سب سے زیادہ تھا۔گلکرسٹ نے سارے ہندوستان سے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے پڑھے لکھے منشیوں کی ایک جماعت تشکیل دی اور انھوں نے چندٹکوں کی خاطر اور انگریز سرکار کی خوشنودی کے لیے سر توڑ محنت کی اور اعلیٰ پائے کی کتب کے تراجم کر کے انعامات اور خطابات حاصل کیے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کتاب میں ہندی اور اُردو کی اصلاحات کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے اور خاص طور پر ہندی اُردو تنازع پر بھی بات کی ہے۔

ہندی اُردو تنازع کی ابتدا کا سن ۱۹۶۷ء اور مقام بنارس کو بتایا جاتا ہے لیکن اس امکان کو خارج از بحث نہیں کیا جا سکتا کہ ہندی اُردو تنازع کی بنیاد بھی گلکرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج میں للو جی لال نے پریم ساگر لکھ کر کی اور اس سلسلے کو بھارتینڈو ہریش چندر (۱۸۵۰ء تا ۱۸۸۵ء) نے ''اُردو کی موت'' کا اعلان کر کے تقویت دی۔اس کے بعد امرت رائے نے A House Divided اور گیان چند نے ایک بھاشا: دو لکھاوٹ لکھ کر کمی پوری کی حالانکہ ان تمام مذکورہ ادیبوں کی شہرت صرف اور صرف اُردو کے سبب ہی ہے اسی سے انہوں نے اپنا رزق بھی کمایا اور پھر یہ نمک حرامی کس لیے؟

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب میں للو جی لال اور بھارتینڈو ہریش چندر کا تو تذکرہ کیا ہے لیکن امرت رائے اور گیان چند جین کی کتاب ایک بھاشا :دو لکھاوٹ،دو ادب پر اپنے تاثرات کا اظہار نہیں کیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے ہندی اور اُردو کی ابتدا کا مسئلہ بھی بیان کیا ہے یعنی ہندی کا وجود پہلے تھا یا اُردو کا۔ اس حوالے سے گیان چند جین نے تو ہندی کو برتری دی ہے لیکن مرزا خلیل بیگ نے اپنے ایک مضمون ''ہندی امپیریلزم اور اُردو'' میں گیان چند جین کے اس بیان کو رد کیا ہے ۔مرزا خلیل بیگ لکھتے ہیں:

> ''گیان چند جین نے اپنی حالیہ متنازع فیہ تصنیف ایک بھاشا:دولکھاوٹ،دو ادب میں ہندی کو اُردو سے قدیم تر زبان ثابت کرنے کے لیے''کھڑی بولی ہندی'' کی تاریخ کا آغاز''اندازاً''۱۱۰۰ء سے کیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔
>
> کھڑی بولی ہندی کی ابتدا جسے''ناگری ہندی'' بھی کہتے ہیں اور جو زمانہ حال کی ''ہندی'' ہے درحقیقت انیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے۔
>
> اُردو جو کھڑی بولی کا نکھرا ہوا روپ ہے اور جس کا ارتقا بارہویں صدی میں دہلی و نواح دہلی میں ہو چکا تھا، اسی کی بنیاد پر انیسویں صدی کی ابتدا میں''کھڑی بولی ہندی'' (زمانہ حال کی ہندی) کی تشکیل عمل میں آئی جسے اولاً نثری زبان کے طور پر استعمال کیا گیا،لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے اسے شعری ذریعہ اظہار کی حیثیت سے اختیار کر لیا گیا۔اس طرح کھڑی بولی ہندی (جدید ہندی)، اُردو کے بعد کا ارتقا ہے۔'' [۱۰]

گیان چند جین کے اس رویے کو صرف تعصب ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی حوالے سے مولوی عبدالحق اپنے

مضمون ''ہندوستانی کیا ہے'' میں لکھتے ہیں:

''جدید ہندی جس کی اشاعت کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے نئے زمانے کی پیدا وار ہے اس نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جنم لیا۔ دراصل یہ اُردو کا بچہ ہے۔ وہ اس طرح کہ عربی فارسی کے لفظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت لفظ بٹھا دیئے تھے۔''[۱۱]

مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی بھی زبان کو بننے میں صدیوں کا عرصہ درکار ہوتا ہے اور ہر زبان کو بننے میں صدیاں لگی ہیں جب کہ مذکورہ بحث میں ہندی کے ارتقائی سفر پر کسی نے بھی بحث نہیں کی۔ اگر گیان چندجین اپنے موقف کو درست سمجھتے ہیں تو ہندی کا ارتقائی سفر بیان کرنا ہوگا جو تاریخی لحاظ سے درست بھی ہوتو بات اپنے آپ ظاہر ہوجائے گی کہ ہندی پہلے وجود میں آئی یا اُردو۔ابھی تک تو گیان چندجین کی بات سے یہ ہی ثابت ہو رہا ہے کہ دنیا کی باقی زبانوں کو تو بننے میں صدیاں لگ گئیں جبکہ ہندی زبان صرف چند سالوں میں ہی زبان کے طور پر مکمل ہوگئی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اُردو ادب کی تاریخیں اور تذکرے لکھنے والوں کی نا انصافیاں کا بھی تذکرہ کیا ہے لیکن قابلِ غور بات یہ کہ نا انصافی کی بنیاد کیا بنائی ہے؟شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے کہ ان تاریخوں اور تذکروں میں ہندوشعرا کا اور ادیبوں کو ان کے رتبے کے مطابق جگہ نہیں دی گئی ہے ۔اور خاص طور پر محمد حسین آزاد کی کتاب آبِ حیات کا ذکر کیا ہے ۔شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''آبِ حیات میں محمد حسین آزاد(۱۸۳۰ء تا ۱۹۱۰ء) کوصرف ایک ہندو شاعر دیا شنکر نسیم (۱۸۱۱ء تا ۱۸۴۴ء) لائق ذکر دکھائی دیا اوران کا بھی تذکرہ آزاد نے تاریخی ترتیب کے صحیح مقام پر نہیں بلکہ میر حسن (۱۷۲۷ء تا ۱۷۸۶ء) کے ساتھ لکھا۔''[۱۲]

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی تحقیق کا انحصار صرف محمد حسین آزاد کی آبِ حیات پر ہی کیا ہے۔ جو غلطیوں کا مرقع ہے۔جہاں تک ہندوشعرا کا ذکر نہ کرنے کی بات ہے تو یہ بات بھی یاد رہے کہ شروع میں تو محمد حسین آزاد نے مومن خان مومن جیسے کلاسیکل شاعر کو بھی آبِ حیات میں شامل نہیں کیا تھا۔اس لحاظ سے آبِ حیات کو مستند نہیں کہا جا سکتا اس کے مستند نہ ہونے پر اُردو کے بہت سے محققین میں اتفاق ہے۔اس لیے شمس الرحمٰن فاروقی کو صرف آبِ حیات پر ہی بھروسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے چنداور ہندوشعرا کا بھی ذکر کیا ہے جن کو آزاد نے آبِ حیات میں شامل بحث نہیں کیا ہے بلکہ نام تک نہیں لیا ہے:

''سرب سنگھ دیوانہ(۱۷۲۷ء/۱۷۲۸ء تا ۱۷۸۸ء)، اجے چند بھٹنا گر(۱۵۵۰ء)، ٹیک چند بہار(وفات ۱۷۶۶ء)، بدھ

سنگھ قلندر(وفات غالباً ۱۷۷۰ اور ۱۷۸۰ء کے درمیان)، ٹیکا رام تسلی(زمانہ ۱۷۸۰ء کے آس پاس)، کانجی مل صبا (زمانہ تقریباً وہی)،جسونت سنگھ پروانہ(۱۷۵۶ء/۱۷۵۷ء)، بندرا بن خوشگو، وفات(۱۷۵۶ء/ ۱۱۵۷ء)، راجا رام نرائن موزوں (وفات ۱۷۶۲ء)، راجا کلیان سنگھ عاشق (۱۷۵۲ء تا ۱۸۲۱ء)، راجا راج کشن داس (۱۷۸۱ء تا ۱۸۲۳ء)۔''[۱۳]

محمد حسین آزاد کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی نے الطاف حسین حالی کی کتاب مقدمہ شعر و شاعری پر بھی اعتراض کیا ہے کہ اس میں ہندوشعرا کے اشعار کی مثالیں نہیں دی گئیں۔شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''مقدمہ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اُردوشعرا کے اشعار اور اذکار جگہ جگہ ملتے ہیں مگر نہیں ملتے تو ہندوشعرا کے شعر نہیں ملتے۔''[۱۴]

شمس الرحمٰن فاروقی نے مذکورہ اقتباس میں جن ہندوشعرا کا ذکر کیا ہے ،کیا ہندو محققین یا تاریخ نگاروں نے ان ہندوشعرا کا کہیں ذکر کیا ہے۔خود شمس الرحمٰن فاروقی کو ان شعرا کا ٹھیک سے زمانے کا بھی نہیں پتا صرف اندازاً تاریخ پیدائش اور وفات لکھ دی ہیں کسی کے تو تین،تین سنین بھی لکھ دیئے ہیں تو کسی کا صرف ایک سن لکھا ہے۔ یعنی خود شمس الرحمٰن فاروقی کو ہندوشعرا کی ادبی روایت کا ٹھیک سے علم نہیں ہے۔ ہندوستان میں خود ہندو ناقدین اور محققین نے ہندی سے زیادہ اُردو پر علمی و تحقیقی کا م کیا ہے جس کی طویل فہرست موجود ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کے ان تمام اقتباسات سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ہندی، اُردو زبان سے پہلے وجود میں آئی ہے اور اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے یا پھر خود شمس الرحمٰن فاروقی اپنے قول کو بے جا درست کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی تحقیق درست ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ہندی نئے زمانے کی پیداوار ہے جس کی بنیاد فورٹ ولیم کالج میں پڑی۔ اس کے علاوہ یہ بات عیاں ہے کہ اُردو میں بہت سے ہندوشعرا اور ادیبوں پر پاکستان اور ہندوستان کی جا معات میں بہت کام ہوا ہے اور جو لائبریریوں میں موجود ہے جن میں لالہ سری رام، جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار، پریم چند، برج نرائن چکبست ،فراق گورکھپوری،کرشن چندر پر تو بہت سارا کام ابھی بھی ہو رہا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اُردو ادب کی شروعات کرنے والوں کا ذکر بھی کیا ہے اور مسعود سعد سلمان لاہوری(۱۰۴۶ ء تا ۱۱۲۱ء) کو اوّلیت دی ہے۔مسعود سعد سلمان لاہوری کے بعد امیر خسرو(۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) کا ذکر آتا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دونوں کی زبان ہندوی ہی تھی لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے ان دونوں کے درمیان زمانی وقفہ کے حوالے سے سوالات اٹھائے ہیں ۔شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''مسعود سعد سلمان لاہوری (۱۰۴۶ء تا ۱۱۱۲ء) اور امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۲ء تا ۱۳۲۵ء) کے مابین پورے دو سو برس کا فصل ہے۔اس مدت میں کیا ہوا؟ کیا وجہ ہے کہ ان دو صدیوں میں کچھ بھی ادب ہندوی میں نہ لکھا گیا؟ یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کا ہندوی کلام محفوظ کیوں نہ رہا'' [۱۵]

لیکن مورخین ادب نے ایسے سوالات کی نشاندہی با کل نہیں کی ہے۔بہت سی ادبی تواریخ میں تو مسعود سعد سلمان کا صرف ایک شعر ہی بتایا گیا ہے۔ایک شعر کہنے والے کو کس طرح شاعری کے پیمانوں پر ماپا جا سکتا ہے۔ مولوی عبد الحق نے اپنی کتاب اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ میں مسعود سعد سلمان کا کوئی ذکر نہیں کیا جبکہ شمس الرحمٰن فاروقی نے تو ان دونوں کی زبان کو ہندوی کہا ہے۔مسعود سعد سلمان کا تو کوئی کلام ہی نہیں ملتا ہے اور جو کلام امیر خسرو سے منسوب کیا ہے اس کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ امیر خسرو کا ہی خالص کلام ہے۔ایسے سولات کے بارے میں مولوی عبد الحق لکھتے ہیں:

''اس کے علاوہ بیسوں پہیلیاں انملیاں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ ان کے نام سے مشہور ہیں جن کی صحت کا اس وقت کوئی معتبر ذریعہ نہیں۔اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انھیں کی ہیں صد ہا سال سے لوگوں کی زبان پر رہنے سے ان کے الفاظ و زبان میں بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے اور بہ ظاہر یہ اُس وقت کی زبان نہیں معلوم ہوتی۔'' [۱۶]

شمس الرحمٰن فاروقی کے مقابلے میں مولوی عبد الحق کی تحقیق درست ہے شمس الرحمٰن فاروقی کی تحقیق پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔اسی حوالے سے مولوی عبدالحق مزید لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ اب تک حضرت امیر خسرو کے ہندی کلام کا سراغ نہیں لگا اور جب تک نہیں ملے گا اس کا افسوس رہے گا۔اس میں ذرا شک نہیں کہ وہ ہندی زبان کے ماہر تھے اور ہندی میں ان کا کلام موجود تھا جس کا اعتراف خود انھوں نے اپنے دیوان کے دیباچے میں کیا ہے۔اگر کبھی ان کا ہندی کلام ملا تو اس وقت اس کی پوری کیفیت اور حقیقت معلوم ہوگی۔فی الحال جو متفرق کلام تذکروں میں ،بیاضوں میں یا جو لوگوں کی زبانوں پر ہے اس کے چند نمونے نقل کر دیئے گئے ہیں۔'' [۱۷]

یہاں بھی اس سوال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ امیر خسرو کا کلام جو لوگوں کی زبانی معلوم ہوا ہے کیونکر خالص رہ سکتا ہے اور اس میں اگر تصرف بھی ہوگیا ہے تو اس کی زبان کیسے خالص ہوسکتی ہے۔اگر گلستان اور شاہنامہ اسلام میں تصرف ہوسکتا ہے تو امیر خسرو کا کلام کیونکر بچ سکتا ہے۔ایک اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ امیر خسرو کے کلام کا تو کہیں سراغ نہیں ملا تو ان سے پہلے کے صوفیائے کرام کا کلام کیسے باقی رہ گیا۔اس بات کی کیا سند ہوسکتی ہے۔

اس بحث کے بعد شیخ بہاؤالدین با جن (۱۳۸۸ء تا ۱۵۰۶ء) اور فخرالدین نظامی (۱۴۳۴ء) کا ذکر کیا

ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے نظری تنقید اور شعریات کی ابتدا کے حوالے سے بھی بات کی ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے اوّلیت امیر خسرو کو ہی دی ہے اور امیر خسرو کی کتاب غـزۃالکمـال کے دیباچے میں تنقیدی زاویے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو کامیاب بھی رہی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے یہاں تک لکھا ہے کہ نظری تنقید کے اشاروں کا سلسلہ ایران یا عرب سے نہیں آیا بلکہ ان کی بنیاد جنھوں نے رکھی ہے وہ تو ہندوستان کے نظریہ ساز ہیں۔شمس الرحمٰن فاروقی نے خاص طور پر ایک شعری اصطلاح ''روانی'' کا ذکر کیا ہے۔یعنی شعر میں روانی اور سلاست ایسی ہو کہ ہر خاص و عام کو آسانی سے سمجھ آجائے۔شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

''خسرو شاید پہلے نظریہ ساز ہیں جنھوں نے ''روانی'' کو بطورِ اصطلاح برتا اور اس بات میں تو بے شک وہ پہلے ہیں کہ انھوں نے ''روانی'' پر ایک خاص پیچیدہ اور داخلیت پر مبنی بحث لکھی۔'' [۱۸]

لیکن یہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ امیر خسرو ہی ''روانی'' کی اصطلاح کے بانی ہیں۔یہ کس طرح ممکن ہے کہ جن ممالک کی ادبی روایت بہت قدیم ہوں اس کے اثرات ہندوستان کے شاعروں پر مرتب نہ ہوئے ہوں خصوصاًایران کے حوالے سے تو اس بحث کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس بحث کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو پر فارسی زبان کے کتنے گہرے اثرات ہیں کہ ان کے شعر کا ایک مصرعہ تو اُردو کا ہوتا ہے اور دوسرا مصرعہ فارسی کا۔ Harold Bloom کی اس بات کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ ''ہر ادب کے دوسرے ادب پر اور اسی طرح ہر شاعر کے دوسرے شاعر پر اثرات ہوتے ہیں یا شعوری اور لاشعوری طور پر اثرات قبول کرتا ہے۔'' [۱۹]

یہاں تک کہ خسرو نے اپنے چاروں کلیات کے دیباچوں میں ''روانی'' کی بحث کو تفصیل سے موضوعِ بحث بنایا ہے اور خسرو نے روانی کی جس اصطلاح کا استعمال کیا ہے بعد میں اٹھارویں صدی کے دبستان دہلی کے شعرا نے بھی اسی کو اپنے کلام میں برتا ہے ۔شمس الرحمٰن فاروقی نے دراصل اپنی کتاب میں چند دوسرے شعرا کا کسی ادبی مقام کا تعین نہیں کیا ہے ان شعرا کا بس مختصر سا تعارف بیان کیا ہے ۔حالانکہ شمس الرحمٰن فاروقی اسی کتاب میں مولانا محمد حسین آزاد پر ہندو شعرا کو آبِ حیات میں جگہ نہ دینے پر اعتراض کر چکے ہیں۔

اسی باب کے آخر میں ملا وجہی اور نصرتی کا سرسری سا تعارف پیش کیا ہے ۔اس کے بعد شیخ خوب محمد چشتی (۱۵۳۹ء تا ۱۶۱۶ء) کا بھی ذکر کیا ہے اور اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے امیر خسرو اور شیخ خوب محمد چشتی کو اُردو شعریات کا اوّلین نظریہ ساز ٹھہرایا ہے۔

کتاب کے اسی باب میں شمس الرحمٰن فاروقی نے سب سے اہم سوال ایک طویل زمانی وقفے کا اٹھایا ہے۔ مسعود سعد سلمان اور خسرو کے درمیان طویل ادبی خاموشی اور پھر خسرو کے بعد دوسرا طویل وقفہ جو ڈیڑھ دو سو

برس پر محیط ہے اور اس کا اختتام گجرات میں ہوتا ہے اور اُدھر شمالی ہند میں محمد افضل کی مثنوی ''بکٹ کہانی'' منظر عام پر آئی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شمال میں اسے اُردو کا پہلا کارنامہ قرار دیا ہے۔

محمد افضل کی وفات ۱۶۲۵ء میں ہوئی اور ان کے بعد جعفر زٹلی (۱۶۵۹ء تا ۱۷۱۳ء) منظر عام پر آتے ہیں شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ ان کے درمیان کوئی ادبی شخصیت منظر عام پر نہ آسکی۔ اس کے بعد کے زمانے میں فارسی نے زور پکڑا اور سولھویں صدی میں ہندی/فارسی فرہنگیں تیار کی گئیں۔

حکیم یوسفی (۱۴۹۰ء تا ۱۵۳۰ء) نے ایک قصیدہ لکھا جس میں انھوں نے ''ہندی'' کے الفاظ و مصادر کے معنی فارسی میں درج کیے اور اجے چند بھٹنا گر نے ۱۵۵۱ء میں مثل خالق باری کے نام سے ایک فرہنگ لکھی اور سولھویں صدی میں لوگوں کا رجحان فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کی طرف ہوتا چلا گیا۔ اس طرح جب ہندی، ہندوی میں جو ادب لکھا جانے لگا تو اس زبان کو ریختہ کا نام دیا گیا۔ لیکن یہاں پھر سے شمس الرحمٰن فاروقی نے مؤرخین ادب سے شکوہ کیا ہے جن میں رام بابو سکسینہ اور حامد حسن قادری کا ذکر کیا گیا ہے کہ رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ کی کتاب میں افضل کا نام تک نہیں لیا ہے اور جعفر زٹلی کو مسخرے شعرا کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

لیکن یہاں شمس الرحمٰن فاروقی کا شکوہ بجا ہے کیونکہ افضل کی بکٹ کہانی بھی ایک خاصے کی چیز تھی اور شمالی ہند میں ادب کا پہلا کارنامہ تھا۔ اس کے علاوہ جعفر زٹلی کو مسخرا کہنا کہاں کا انصاف ہے۔ جعفر زٹلی کو تو پھانسی بھی سچ لکھنے کی پاداش میں دی گئی تھی جس پر کسی بھی صاحبِ بصیرت نقاد کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے جعفر زٹلی تو اُردو کا پہلا حقیقت نگار شاعر ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب تاریخ ادب اُردو میں افضل اور زٹلی کا ذکر کیا ہے لیکن ان کا کوئی ادبی مقام و مرتبہ کا تعین نہیں کر سکا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا درست ہے کہ ریختہ کے ابتدائی نمونے افضل اور زٹلی کے کلام میں ملتے ہیں۔

چھٹا باب ولی دکنی کے حوالے سے ہے جس پر شمس الرحمٰن فاروقی نے کافی طویل بحث کی ہے اور ولی دکنی کے حوالے سے بہت سے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو اہمیت کے حامل ہیں اور اس سے پہلے کسی نے اس طرف کوئی ادبی پیش رفت نہیں کی۔ شروع میں دیوان ولی کے نسخوں کی تعداد پر اعتراض کیا جو ۱۹۶۶ء میں لگائے گئے تخمینے میں دیوان ولی کے ۶۵ نسخے ایسے موجود تھے جن میں تاریخ کتابت درج ہے اور ۵۳ ایسے ہیں جن میں تاریخ کتابت درج نہ تھی۔ ان کے علاوہ ۳۳ ایسی مخلوط بیاضیں موجود ہیں جن میں ولی کے کلام کا انتخاب موجود تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ایسے بہت سے نسخوں کی نشاندہی کی ہے جن کو اس تعداد میں شامل نہیں کیا گیا۔ جن میں ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کی لائبریری، خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور، یوپی کی ریاستی آرکائیوز لائبریری الہ

آباد اور اس کے علاوہ نورالحسن ہاشمی اور شمیم حنفی کے کتب خانوں میں بھی دیوان ولی کے نسخے موجود ہیں۔

اس کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی نے ولی کی پیدائش اور وفات کے بارے میں ناقدین کی آراء میں اختلافات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ولی دکنی کی پیدائش کے دو سنین دیئے ہیں، ۱۶۶۵ء اور ۱۶۶۷ء اور انتقال، ۱۷۰۷ء اور ۱۷۰۸ء۔ انتقال کی تاریخوں میں بہت اختلاف ہے جیسے ۱۷۲۰ء، ۱۷۲۵ء اور ۱۷۳۵ء۔شمس الرحمٰن فاروقی نے دو حوالے بھی بیان کیے ہیں ان میں ایک حوالہ تو ظہرالدین مدنی کا ہے اور دوسرا ڈاکٹر جمیل جالبی کا۔ ظہرالدین مدنی نے تو ولی کی تاریخ وفات میں مہینہ اور دن تک بتا دیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ولی کی تاریخ وفات کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۷۲۰ء/۱۷۲۵ء کے دوران ان کا انتقال ہوا ہوگا۔ اس تاریخ میں زمانی فصل ۵ سال کا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق بہت ناقص ہے۔ ان کے اندازے میں زمانی وقفے کی وجہ سے صداقت نہیں ہے اس لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کے بعد شاہ سعد اللہ گلشن اور ولی کے درمیان اُستاد شاگرد کے رشتے کا بھی کھوج لگایا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے یہاں پر قیاس سے کام لیا ہے کہ ولی دہلی آئے ہوں گے شاہ گلشن سے ان کی ملاقات بھی ہوئی ہوگی جس کی بنیاد وہ فارسی کے مختصر سے رسالے نورالمعرفت کو بتاتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے شاہ گلشن کے دو شاگرد ہوں اور دونوں کا نام ولی ہو۔لیکن ظہرالدین مدنی نے واضح الفاظ میں ولی کو شاہ گلشن کا شاگرد بتایا ہے۔ بہر حال ولی جب دہلی آئے تھے اس وقت وہ باقاعدہ ایک غیر معمولی شاعر تھے۔ ریختہ کی روایت کو مضبوط کرنے میں ولی کی شاعری کا بہت عمل دخل ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''ولی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قطعی طور پر اور ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیا ہے کہ گجری اور دکنی کی طرح ہندی یا ریختہ میں بڑی شاعری کی صلاحیت ہے۔ولی نے یہ بھی دکھایا کہ ریختہ یا ہندی میں یہ بھی قوت ہے کہ سبک ہندی کی فارسی شاعری پر فوقیت لے جا سکتی ہے یا کم از کم اس کے شانہ بشانہ تو چل سکتی ہے۔'' [۲۰]

شمس الرحمٰن فاروقی نے جو بحث ولی کے کلام میں تبدیلیوں کے حوالے سے کی ہے وہ معنی خیز ہے کہ ولی کے کلام میں تبدیلیاں شاہ گلشن کے مشورے سے ہوئیں ہیں یا یہ ولی کی اپنی شعوری کوشش کے نتیجے میں ہوئیں یا زبان میں ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ تھیں۔ یہاں اس بات کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی بھی شاعر اپنے سے پہلی شاعری کی روایت سے اثر قبول نہ کرے۔ ہر شاعر پر کسی دوسرے شاعر کی شاعری کے اثرات ہوتے ہیں اور اسی طرح ادب کی روایت جاری رہتی ہے جو ختم نہیں ہوتی۔ولی کے کلام میں تبدیلیاں انہی روایات کا پیش خیمہ ہیں۔

آخری باب کا عنوان ''نئے زمانے، نئی ادبی تہذیب'' ہے۔ ولی کے بعد کے دور کو نئے زمانے اور نئی ادبی

تہذیب کی بنیاد کہا ہے۔ اس دور میں لسانی مباحث ضرور سامنے آئے لیکن وہ بھی تذکروں اور دواوین کے دیباچوں سے۔ لیکن ان میں تفصیلی بحث نہیں کی گئی تھی لہٰذا ہم اسے نئے زمانے اور نئی ادبی تہذیب کی بنیاد نہیں کہہ سکتے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کے اسکولوں تک لا کر اس بحث کو مکمل کیا ہے۔ لیکن یہاں پر بھی شمس الرحمٰن فاروقی کے نظریات میں جھول محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کی تقسیم ۱۸۵۷ء کے بعد کی پیداوار ہے۔ ان دبستان شعرا کے اندر ایک دوسرے کے خلاف تعصب ضرور تھا لیکن اس تعصب یا چشمک کی وجہ سے ان کو تقسیم کرنا غلط ہے اور جو داخلیت، خارجیت کی اصطلاح ان کے لیے استعمال کی گئی ہے کسی حد تک وہ بھی درست نہیں ہے۔ کیا دونوں اصطلاحات دونوں دبستانوں میں موجود نہیں ہے۔ یعنی داخلی اور خارجی جذبات دونوں دبستانوں کے شعرا کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں۔ اس باب کا اختتام شمس الرحمٰن فاروقی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ سروش سخن ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اُردو ادب کے زمان اور مکان دونوں ہی بدلے جا رہے تھے اور ہمارا بیان یہیں ختم جانا چاہیے۔[۱۱] شمس الرحمٰن فاروقی کی اس کتاب کی بنیاد صرف قیاس پر ہے۔ لیکن آخری باب جس میں ولی دکنی پر تفصیل سے بحث کی ہے معنی خیز ہے۔ جس پر مزید تحقیق کر کے ولی دکنی کے حوالے سے ادب میں نئی پیش رفت کے امکان موجود ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، اُردو کا ابتدائی زمانہ، تیسرا ایڈیشن، آج، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۱۲، ۱۳

۲۔ ایضاً، ص، ۱۳

۳۔ ایضاً، ص، ۲۴

4. Mark Aronoff,Janie Rees-Miller, Edited by, The Hand book of Linguistics, Blackwell, Publisher Ltd, India, 2003, P:19

۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی، اُردو کا ابتدائی زمانہ، تیسرا ایڈیشن، آج، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص، ۱۶

۶۔ ایضاً، ص، ۱۷

۷۔ وقار عظیم، سید، پروفیسر، فورٹ ولیم کالج: تحریک اور تاریخ، ترتیب و تعارف: سید معین الرحمٰن، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۲۲۱

۸۔ ایضاً، ص:۲۲۱

۹۔ اسمٰعیل میرٹھی حیات وکلیات، مرتب محمد اسلم سیفی، طبع سوم، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:۸۲

۱۰۔ اُردو زبان اور رسم الخط، ترتیب و تدوین، فتح محمد ملک، پروفیسر، ہندی امپیریلزم اور اُردو، مرزا خلیل بیگ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۴

۱۱۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، ہندوستانی کیا ہے، مشمولہ: اُردو زبـــان اور اُردو رســـم الـخـط ، ترتیب و تدوین: فتح محمد ملک، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص: ۹۵

۱۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، اُردو کا ابتدائی زمانہ، تیسرا ایڈیشن، آج، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۴۲

۱۳۔ ایضاً، ص: ۴۳

۱۴۔ ایضاً، ص: ۴۴

۱۵۔ ایضاً، ص: ۶۶

۱۶۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر، اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ، انجمن ترقی اُردو پاکستان، گلشن، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۷

۱۷۔ ایضاً، ص: ۴۵

۱۸۔ ایضاً، ص: ۷۹

19. Harold Bloom, The Anxiety Of Influence: A theory of poetry, Second Edition, Oxford University Press, New York, 1997, P:30

۲۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، اُردو کا ابتدائی زمانہ، ص: ۱۳۸

۲۱۔ ایضاً، ص: ۱۷۸